اکیلی بستیاں
محبوب خزاں

شاعری کی نئی روایت کو پروان چڑھانے میں محبوب خزاں کا حصہ کسی سے کم نہیں۔ وہ ان شعرا میں سے ایک ہیں جنہوں نے قدیم اور جدید کے درمیان ایک پل بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ محبوب خزاں کی انفرادیت ان کا سب سے الگ لہجہ اور باریک بیں زاویہ نظر ہے۔ وہ اتنے دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہر سننے والے کو اپنے دل ہی کی آواز محسوس ہو۔ وہ زندگی کو اس قدر قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ آنکھ اور شے کا فاصلہ مٹ جائے۔ مگر یہ کام شاعری اور ساحری دونوں زمروں میں آتا ہے۔ چنانچہ محبوب خزاں نے ایک جداگانہ جہان گفتگو تخلیق کیا ہے! جب ہم اس جہان میں پہنچتے ہیں تو ہمیں اچھوتی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ جہان گفتگو اک سحر ہے جو خود شاعر کو بھی مسحور کرنے پر قدرت رکھتا ہے' اس میں تکمیل کی خواہش بھی پیدا کرتا ہے اور اسے کم گوئی کی طرف بھی مائل کر دیتا ہے۔ چنانچہ محبوب خزاں نے کم کہا ہے مگر اچھا کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے اس میں ایسی بے ساختگی ہے جو خال خال ہی نظر آتی ہے۔

شہزاد احمد

۱۶ر اپریل ۱۹۸۶ء

اکیلی بستیاں

محبوب خزاں

جہانگیر بک ڈپو ○ اردو بازار ○ لاہور

ترتیب

محبوب خزاں[1]

دورِ حاضر کا ایک شاعر ہے محبوب خزاںؔ۔ ہر سال اردو شاعری کا جائزہ لینے والے نقادوں کی توجہ سے محروم اور عام قارئین کی سمجھ سے بالاتر۔ ممکن ہے اُسے پہچاننے والا کوئی نہ ہو، لیکن اُس کے جلنے والے یقیناً بہت ہوں گے۔

- - - - - - - - - - - -

خزاںؔ کی شاعری واقعی ایک نئی آواز کی ترجمان ہے۔ اُس کی آواز، اُس کی زبان، اُس کا آہنگ، اُس کا لہجہ، اُس کے موضوعات کسی اور سے

---

[1] یہ مضمون 'اکیلی بستیاں' کی اشاعت سے بہت پہلے ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا تھا۔ یہاں اس مضمون کا تقریباً نصف حصہ پیش کیا جارہا ہے۔

نہیں ملتے۔ اُس کی شاعری کی یہ خصوصیت اطمینان بخش بھی ہے اور امید افزا بھی۔ خصوصاً اِس لیے کہ آج یا ہمیشہ کی طرح آج بھی اردو شاعری میں تقلید کا بازار بہت گرم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر نئے شعراء بعض معاصرین یا متقدمین کو دوبارہ لکھنے میں مصروف ہیں اور کچھ عرصے کے بعد جب وہ پلٹ کر اپنے ماضی کو دیکھیں گے تو اُنہیں محسوس ہوگا کہ اُن کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔

خزاںؔ ایسی غزل یا نظم کہنے کا قائل نہیں جس سے اُس کی شہرت میں اضافہ ہونے کی بجائے اُس کے معاصرین کی شہرت میں اضافہ ہو یا اُسے فائدہ پہنچنے کی بجائے متقدمین کی روحوں کو ثواب پہنچے۔ شاعری کے باب میں اُس کا اصول جس پر ہر شاعر کو عمل کرنا چاہیے یہ رہا ہے کہ کم کم کہو، اپنا کہو، اچھا کہو۔ اچھا کہنے کے لیے عموماً کم کہنا ضروری ہے اور اچھا کہنے کے معنی اپنا کہنے کے ہیں۔ شاعر تو وہی ہے جو اپنی شخصیت کی ترجمانی کرے نہ کہ دوسروں کی شخصیت کا ترجمہ۔ شاید ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ شاعری خون کو روشنائی میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ خزاںؔ شاعری کو کاغذ میں جان ڈالنے سے تعبیر کرتا ہے اور اِس کے لیے آنکھوں میں عکسِ تازہ کی شرط کو لازمی قرار دیتا ہے۔

اُن سے کاغذ میں جان کیسے پڑے
جن کی آنکھوں میں عکسِ تازہ نہیں

آنکھوں میں عکسِ تازہ اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب زندگی کا براہِ راست مطالعہ کیا جائے اور اپنی شاعری کی بنیاد دوسروں کی شاعری پر نہ رکھی جائے۔

خزاںؔ کو اپنے ناعاقبت اندیش معاصرین سے شکایت ہے تو یہی ؎

اپنی تلاش کون کرے، دور کون جائے
اہلِ سخن ہیں اہلِ سخن کی تلاش میں

زندگی اور آدمی کا یہی مطالعہ جس کا مشورہ دوسروں کو دیا گیا ہے خزاںؔ کی شاعری کا سرچشمہ ہے۔ اُس کی شاعری اور جو کچھ بھی ہو صدائے بازگشت ہرگز نہیں ہے اُس نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ قطعات بھی لکھے ہیں اور گیت بھی۔ اِن تمام اصناف میں اُس نے وہی کچھ لکھا ہے جو اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اپنے دماغ سے سوچا ہے اور اپنے دل میں محسوس کیا ہے۔ وہ ایک مخصوص اندازِ فکر اور مخصوص اندازِ بیان کا شاعر ہے۔ اُس کے اندازِ نظر میں نہ صرف نُدرت ہے بلکہ گہرائی بھی ہے۔ اُس کے اندازِ بیان میں نہ صرف جدت ہے بلکہ رعنائی بھی ہے۔

زندگی کا مشاہدہ اور آدمی کا مطالعہ خزاںؔ کی شاعری کے محرکات

سہی لیکن اُس کی شاعری میں موجودہ زندگی اور جدید انسان کی تصویریں نہیں ملتیں یعنی وہ زندگی اور آدمی کو اُس کے معاصرانہ مسائل کی روشنی میں نہیں دیکھتا۔ اپنے زمانے کے سماجی انتشار، اخلاقی انحطاط، تہذیبی بحران، مذہب اور سائنس کے تصادم، عقائد اور روایات کی جانکنی، قدیم اقدار اور جدید معیار کی آویزش، ایک مرتی ہوئی دنیا اور ایک اُبھرتی ہوئی دنیا کی کشمکش، غرض کہ دورِ حاضر کے حالات خزاں کے فن کارانہ شعور کا جزو نہیں بنے ہیں۔ پھر بھی اُس کی شاعری تنقیدِ حیات سے خالی نہیں۔

خزاں کو اردو شاعروں کے اُس خاندان کا فرد کہنا غلط نہ ہوگا جس کی شاعری پر جذبے کی بہ نسبت فکر کا عنصر غالب ہے۔ اُس کے یہاں جذبات بھی ہیں اور جذبات میں شدت بھی۔ لیکن مجموعی طور پر وہ جذبات کا نہیں افکار کا شاعر ہے یہی وجہ ہے کہ اُس کی عشقیہ شاعری میں بھی جذبات یا جذباتی صورتِ حال کا بیان کم ہے اور اُس پر تبصرہ یا اُس کا تجزیہ زیادہ۔

خزاںؔ بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے یا نظم کا؟ جو شاعر دونوں صنفوں میں انفرادی رنگ کا مالک ہو اور جس کی ذات سے دونوں صنفوں میں قابلِ قدر اضافے کی توقع وابستہ کی جا سکتی ہو اُس کے بارے میں اِس قسم کا سوال اٹھانا بیکار ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکر و فن کی جس بلندی پر وہ اپنی غزلوں میں نظر آتا ہے اُس بلندی تک اُسے اپنی نظموں میں پہنچنا باقی ہے۔ تنوع، تازگی، توانائی اور ترنم اُس کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ بعض شعرا دوسروں کی تقلید سے بچتے ہیں تو اپنی تقلید آپ کرنے لگتے ہیں یعنی زندگی بھر ایک ہی قسم کا اسلوب اور ایک ہی قسم کی تکنیک استعمال کرتے رہتے ہیں۔ خزاں نہ دوسروں کی تقلید کرتا ہے نہ اپنی تقلید۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں ہیئت، اسلوب، آہنگ اور لب و لہجے کے اعتبار سے بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ زبان کی صحت اور الفاظ کی نشست کے معاملے میں کلاسیکی شعراء کی طرح سخت گیر واقع ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں جدید شعرا کی طرح نئے تجربے کا جذبہ اور نئے تجربے کی ہمت بھی پائی جاتی ہے یعنی بیک وقت وہ تکمیل پرست (Perfectionist) بھی ہے اور تجربہ پسند (Experimentalist) بھی۔ اُس کے

یہاں نہ صرف نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں اور نئے فقرے ملتے ہیں بلکہ نئی بحریں بھی۔ یوں تو شاعری میں جادو جگانے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں اور ہر اچھا شاعر ضرورت کے مطابق مختلف طریقوں (devices) کو استعمال کرتا ہے لیکن خزاں کے یہاں لفظ کی تکرار، سرحرفی الفاظ (alliteration) قولِ محال (paradox) اندرونی قافیے (internalrhyme) طنز اور گفتاری زبان کا استعمال نمایاں ہے۔ گفتاری زبان، گفتاری لہجہ اور گفتگو کے ٹکڑے جس قدر خزاں کی شاعری میں ملتے ہیں اتنے شاید کسی اور جدید شاعر کے یہاں نہ ملیں۔

خزاں کی شاعری ایک حد تک لوگوں کو مشکل اور مبہم معلوم ہوتی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ کسی حد تک مشکل اور مبہم ہے بھی۔ غزلوں میں اُس کے بعض سادہ اشعار بھی سامعین یا قارئین پر اپنا مفہوم ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اُن میں کوئی نہ کوئی لفظ یا بات ایسی ہوتی ہے جو سننے والے یا پڑھنے والے کو اُلجھن میں مبتلا کر کے چھوڑتی ہے۔ مثلاً ؎

ناز و انداز دل دُکھانے لگے

اب وہ فتنے سمجھ میں آنے لگے

دامِ ہزاروں دل کے لیے
کون چلا منزل کے لیے

ان اشعار کی سادگی بڑی پُرفریب سادگی ہے۔ اِن کو سن کر یا پڑھ کر سمجھنے کا دعویٰ بہت سے لوگ کر بیٹھیں گے۔ لیکن اگر اُن سے تشریح کا مطالبہ کیا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو آزمائش میں مبتلا پائیں گے۔ خزاںؔ کے بعض اشعار اِس لیے بھی مشکل اور مبہم معلوم ہوتے ہیں کہ اُن میں ایک ایسے طرزِ احساس اور طرزِ بیان سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے جو ہمارے لیے قطعاً اجنبی ہے۔ مثلاً

سنبھالنے سے طبیعت کہاں سنبھلتی ہے
وہ بے کسی ہے کہ دنیا رگوں میں چلتی ہے

میں کہیں اور کس طرح جاؤں
تو کسی اور کے علاوہ نہیں

یہ سکونِ بے جہت یہ کشش عجیب ہے
تجھ میں بند کر دیا کس نے شش جہات کو

بعض اوقات خزاںؔ کے اشعار حد درجہ ذاتی ہونے کی بنا پر الجھن کا باعث ہوتے ہیں۔ بعض اوقات پُرانے علائم، الفاظ اور اصطلاحات کو نئے معنوں میں استعمال کرنے کی وجہ سے اُس کے اشعار کو سمجھنے میں

دشواری ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

منزلِ صبح آگئی شاید راستے ہر طرف کو جانے لگے

ساحلِ خیال پر کہکشاں کی چھوٹ تھی
ایک موج لے گئی ان تجلیات کو

کہیں کہیں نئی زبان یا نیا محاورہ ایجاد کرنے کی بنا پر اس کی شاعری پڑھنے والوں کو سمجھنے سے معذور اور اعتراض کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مثلاً ؎

بے رنگ ہے حکایتِ خونِ جگر خزاںؔ
خونِ جگر سے رنگ کی قیمت خریدیئے

قیمت خریدنا نہ صرف نیا محاورہ معلوم ہوتا ہے بلکہ بے معنی محاورہ بھی۔ لیکن خزاںؔ کے پاس اِس کا جواز یہ ہے کہ جب آپ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے ملازمت کرتے ہیں تو آپ کا ملازمت کرنا ضروریاتِ زندگی کی قیمت خریدنے کے برابر ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ خزاںؔ کے کسی مصرع یا شعر پر زبان، بیان یا خیال کے اعتبار سے کوئی اعتراض کیجیے تو اُس

کا جواب سن کر وہ صورت حال پیش آتی ہے جس کا اظہار اِس مصرع میں کیا گیا ہے ؎

ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

خزاںؔ کی بعض نظمیں اُس کی غزلوں سے کچھ زیادہ ہی مشکل اور مبہم معلوم ہوتی ہیں جس کا ایک سبب غالباً یہ ہے کہ خزاںؔ کے جذبات کم سخن ہیں اور اس کے افکار خطِ مستقیم پر چلنے کے عادی نہیں۔ وہ براہِ راست بیان پر بالواسطہ بیان کو ترجیح دیتا ہے اور اظہار پر اشارے کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے بیان میں ربط و تسلسل کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے اور یہی کمی اُس کی نظموں کو مشکل یا مبہم بنا دیتی ہے۔ 'چاند کے مسافر' جو خزاںؔ کے نزدیک اُس کی بہترین نظم ہے اُس کی مشکل ترین یا مبہم ترین نظم بھی کہی جا سکتی ہے۔ اِس نظم کے موضوع کا تعیّن آسان نہیں۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اِس کا کوئی مرکزی موضوع ہے ہی نہیں۔ مختلف اشعار زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارے کرتے نظر آتے ہیں۔ اِس میں زندگی کی ماہیت کی تعریف (definition) بھی ہے اور موجودہ انسانی صورت حال کی ترجمانی بھی۔ یہ نظم بیک وقت شخصی بھی معلوم ہوتی ہے اور غیر شخصی بھی۔ فلسفیانہ بھی معلوم ہوتی ہے اور سیاسی

بھی ۔ اِس نظم میں شاعر نے اپنے آپ کو یا شاید انسان کو

(paradoxical situation) میں دکھایا ہے ؎

چاند کے مسافر ہیں چاندنی سے بھاگے ہیں

خود یہ نظم بھی ایک paradoxical خصوصیت کی حامل ہے

۔یعنی اِس کے تقریباً تمام اشعار واضح ہیں لیکن نظم واضح نہیں۔ یہ سب

کچھ کہہ چکنے کے بعد اِس کا اعتراف ضروری ہے کہ یہ نظم اُن نظموں میں سے

ہے جن سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُن کو پورے طور پر سمجھنا ضروری

نہیں۔ اِس کے ہر شعر میں ترشے ہوئے ہیرے کا حسن اور اُس کی چمک

پائی جاتی ہے۔ کئی مصرعے اور کئی شعر تو صرف ایک ہی دفعہ پڑھنے سے

ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

چاند ہو تو کال کی لہر اور چڑھتی ہے

رات اور گھٹتی ہے بات اور بڑھتی ہے

جنگ سے جلے دنیا چاند کو چلے پاگل

آنکھ پر گرے بجلی کان میں پڑے کاجل

خواب جینے والوں کے چال مرنے والوں کی

اپنے پاس حسرت ہے کچھ نہ کرنے والوں کی

اس ہجومِ حیراں میں ہم جو سب سے آگے ہیں
چاند کے مسافر ہیں چاندنی سے بھاگے ہیں

"چاند کے مسافر" کے علاوہ 'اکیلی بستیاں' 'دیوار سے گفتگو' 'دیوداسی'

_______ 'کیف سے خمار تک'۔ 'یہ محبت کہاں جائے گی'۔ 'رہگذر کے بعد'۔ 'دن بہار کے'۔ 'جادو کرنے والیاں'۔ 'تم کہاں ہو'۔ 'سوال'۔ 'تمہاری قسمت میں جھوٹ ہے'۔ _______ خزاں کے فکر و فن کی نمائندہ نظمیں ہیں. خزاں کی شاعری اپنے ملک کے مسائل و مناظر (Landscapes) کی شاعری نہیں۔ لیکن 'اکیلی بستیاں' مغربی پاکستان کے ایک مقام کی ایسی مصوری ہے کہ منظر نگاری سے متعلق اردو کی تمام اچھی نظموں میں اسے کہیں بھی رکھ دیجئے اس کی دل آویز انفرادیت ماند پڑنے کی نہیں۔ میں نے اِس نظم کے لیے مصوری کا لفظ غلط استعمال کیا۔ دراصل اِس میں مصوری کی بجائے فوٹوگرافی کا آرٹ نظر آتا ہے۔ ایک پہاڑی علاقے کی بکھری ہوئی زندگی، فطرت کے ساکن اور انسان کے متحرک مناظر کے ساتھ لفظوں میں منتقل ہوگئی ہے۔ 'جادو کرنے والیاں' سراپا نگاری کی ایک خوبصورت

مثال ہے۔ آہنگ اور ترنم کے اعتبار سے اِس نظم کو گیت کہنا زیادہ موزوں
ہوگا۔ اسی طرح 'کیف سے خمار تک' خاکہ نگاری کی بڑی دل آویز مثال ہے۔
چھوٹی بحر اور چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں 'کسی' کی کیسی جیتی جاگتی تصویر کھینچ
دی گئی ہے۔ نظم کسی کی شخصیت کے ظاہری نقوش کی مصوری کے علاوہ اس
کے روحانی المیے کی غمازی بھی کر رہی ہے۔ 'اکیلی بستیاں' کے سوا خزاں کی
تمام نظمیں داخلی اور شخصی ہیں۔ وہ سب کی سب اُس کے ذاتی، جذباتی اور
نفسیاتی مسائل سے پیدا ہوئی ہیں۔ اِس لحاظ سے اس کی نظموں کا موضوعاتی
دائرہ اُس کی غزلوں سے محدود تر ہے۔ لیکن ان نظموں کی فنی رعنائی اور فکری
گہرائی سے انکار ممکن نہیں۔ خزاں نے اپنی شاعری کو ابلتے ہوئے جذبات
یا مانگے کے تصورات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی
شاعری میں اگر ایک طرف انفعالی لذتیت نہیں ہے تو دوسری طرف
کوئی سماجی یا سیاسی مقصدیت بھی نہیں۔ خزاں کا ایک مصرع ہے ؎

زندگی ۔۔۔ اک خرامِ بے جہت

ممکن ہے اِس مصرع کی بنا پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ خزاں اپنے زمانے کے مشہور و
مقبول فلسفی سارتر ۔ یا کامو سے متاثر ہے۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ
جہاں تک مجھے علم ہے خزاں کسی مخصوص فلسفی یا فلسفے سے متاثر

نہیں ہے۔ وہ اپنا فلسفی آپ بننے کے درپے بھی نہیں۔ لیکن اُس کی شاعری میں سوچ کی لہر ہر جگہ چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس تناظر (perspective) سے وہ زندگی کو دیکھتا ہے اُس کی فراہمی میں علم و فلسفہ کی بجائے اُس کی زندگی کے مرکزی تجربے یعنی ناآسودہ محبت کو دخل ہے۔ اُس کی ناآسودہ محبت ہی نے اُسے رواقی (stoic) اور کلبی (cynic) بنا دیا ہے۔

خزاںؔ نے اب تک کوئی طویل نظم نہیں لکھی۔ اُس کی اختصار پسندی شاید اُسے لکھنے بھی نہ دے۔ بہرحال اختصار اور فنی تکمیل خزاںؔ کی نظموں کی خصوصیات میں سے ہیں۔

ایک دفعہ مجھ سے دورانِ گفتگو میں خزاںؔ نے اچھی غزل کی تعریف یوں کی تھی کہ مطلع اور مقطع دونوں اچھے ہوں۔ بیچ کے پانچ شعر اچھے ہوں — اور آٹھواں شعر نہ ہو۔ وہ غزل میں بھرتی کے اشعار اور شعر میں بھرتی کے الفاظ کا سخت مخالف ہے۔ ایک سخت گیر اور خود آگاہ فن کار کی حیثیت سے اُس نے اپنے آپ کو کئی فنی قیود کا پابند بنا رکھا ہے۔ مثلاً غزل کہتے وقت اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک غزل میں کوئی مضمون، کوئی لفظ اور کوئی قافیہ دوبارہ نہ آنے پائے۔ وہ اپنی شاعری کے بعض کلیدی الفاظ (مثلاً سادگی۔

خریدیئے وغیرہ) اور بعض کلیدی خیالات کی تکرار کو اپنی کمزوری تصور کرتا ہے۔ ایک مرتبہ جب اُس نے مجھ سے اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا تو میں نے کہا تھا کہ اگر کسی شاعر کے یہاں اِن دو باتوں کا ہونا کمزوری ہے تو دنیا کے تمام بڑے شاعر اِس کمزوری میں مبتلا رہے ہیں۔ خزاں کی غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت وحدتِ تاثر ہے جس کی تخلیق میں اُس کی ردیفوں کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ وہ شاعری کو دوسروں کے عکس واثرات سے اِس حد تک محفوظ دیکھنا چاہتا ہے کہ اُسے اپنی شاعری میں توارد تک گوارا نہیں۔

- - - - - - - - - - - -

شاعری میں اُس کا نظریہ یہ رہا ہے کہ "A poet should face his own music." اور اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنی موسیقی کا سامنا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اُس نے اپنے بعض معاصرین کی مقبولِ عام موسیقی کو اپنانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

خزاں کے نزدیک کسی فن میں مہارت کا معیار یہ ہے کہ آدمی سکون و سادگی کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کرے ؎

جو کھیل جانتے ہیں اُن کے اور ہیں انداز بڑے سکون بڑی سادگی سے کھیلتے ہیں

اِس لحاظ سے اگر خزاں کی شاعرانہ قدرت کا اندازہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ابھی وہ شاعری میں سکون و سادگی کے درجے تک نہیں پہنچا۔ ابھی اُس کے یہاں الفاظ اور معنی کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ ابھی اُس کے اسلوب یا لہجے کی جدت طرازی کی کوشش (Strain of novelty) نمایاں ہے۔ ابھی اُس کی شاعری صرف اپنی ذات تک محدود نہ ہونے کے باوجود بڑی حد تک اپنی ذات ہی پر مرکوز ہے۔ ابھی اُس کے تجربات میں تنوع کے باوجود اس کا تناظر بہت وسیع نہیں ہے۔ لیکن اِن کوتاہیوں کے باوجود اُس کی شاعری اردو کے شعری سرمائے میں وقیع اضافہ بھی ہے اور وقیع تر اضافے کا وعدہ بھی۔ اِس بنا پر اُس کے شاعرانہ ارتقا کو غور سے دیکھتے رہنا ازبس ضروری ہے۔

نظیر صدیقی

۱۲ مارچ ۱۹۶۱ء

چاند کے مسافر

محبوب خزاں کی شاعری خوبصورت شاعری ہے۔ جہاں سے
شروع کیجئے ایک نئی خوبصورتی سامنے آئے گی۔ یہ خوبصورتی پُرتصنع نہیں
سادہ ہے۔ ایک بھولپن اور معصومیت اس سادگی کے ساتھ ہے مگر
یہ معصومیت ایک طرف ہے اور دوسری طرف تجربے کی آگہی۔ تجربہ
کی گہرائی اور سچائی جیسے وہی حقیقت ہلکی بھی ہے اور وہی حقیقت گہری بھی
اس شاعری میں بھوری پہاڑیاں، کاجل، آنسو۔ ناچتے جزیرے
اور بہت سارے منظر ہیں، یہاں تک کہ ہم جدید عہد کی طیارہ ساز
ہوا میں سانس لینے لگتے ہیں۔ یہ شاعری نازک اور خوبصورت ہے مگر
اسی شاعری میں خزاں کی بصیرت بڑی تلخ حقیقتوں کا انکشاف کرتی
ہے، جدید عہد کی اُس فضا میں ہمیں لے آتی ہے جہاں عالمی جنگ کی
دہشت ہے اور اخلاقی قدریں بین الاقوامی بازار ہی سے نہیں خود اپنے

بازار سے بھی رخصت ہو چکی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس صنعتی
عہد میں بھی خزاںؔ کی شاعرانہ روح جادو کی فضا سے قوت اخذ کرتی ہے
وہ خود پوچھتے ہیں خزاںؔ تم آج تک اسیرِ طلسمات کیسے ہو؟ یہ طلسم
بندی آئینۂ جہاں کیا ہے۔ کاجل، آنسو، جادو اور ہر طرف سیدھی
سادی بھولی بھالی جادو کرنے والیاں۔ آپ کو اِن سیدھی سادی بھولی
بھالی جادو کرنے والیوں کا لطف اُس وقت آسکتا ہے جب آپ
تھوڑی دیر کے لیے طلسمِ ہوش رُبا میں شریف جادوگرنیوں، رذیل
جادوگرنیوں، الھڑ جادوگرنیوں اور چالاک جادوگرنیوں کا حال دیکھ لیں۔
مثلاً ایک پانی میں پاؤں ڈال کر خوش فعلی کر رہی ہے، گھٹنوں تک
پائنچے چڑھا لیے ہیں۔ اس کے نگاریں پاؤں اور گوری گوری پنڈلیاں
دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ لپٹ جائیں۔ وہ کہتی ہے ٹھہرو تم مجھ کو یہاں
ستاؤ گے میں ذرا تم سے الگ جا کر پانی سے کھیل لوں۔ لوگ روکتے
ہیں مگر وہ نہیں مانتی۔ کہتی ہے میں دور نہیں جاؤں گی بس تم سے
گز دو گز ہٹ کر منہ دھوؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دور پر ایک چشمہ
کے کنارے بیٹھ جاتی ہے۔ ہاتھ منہ دھو کر ایک بیضۂ بیہوشی اپنے پاس سے نکالتی
ہے، اس پر سبز، سرخ اور زرد لکیریں تھیں اور کئی طرح کے پھول

بنے ہوئے تھے۔ پس وہ بیضے لے کر اِٹھلاتی ہوئی آتی ہے اور کہتی ہے" اے جی اے جی میں منہ دھو رہی تھی کہ مجھے یہ پڑا ہوا ملا۔ صاحب اس میں سے خوشبو بھی آتی ہے، سامری کی قسم مجھے دل سے بھاتی ہے۔"

یہ کہتی جاتی تھی اور اس طرح کمر اور کولہوں کو بل دیتی کہ معمار نے اُس کو کھینچا اور کہا میرے ساتھ سو رہو۔ اُس نے کہا میری کلائی ٹوٹ جائے گی اور نگوڑا یہ وقت سونے کا کون ہے۔ سامری کی قسم اِس وقت تمہاری زبردستی سے دل دھڑکنے لگا۔ خیر اِسے سونگھ کر ذرا دیکھو تو سہی اِس نے سونگھا اور سونگھتے ہی بے ہوش ہوگیا اور پھر اُسے جادوگرنی اٹھالے گئی۔ لیکن خزاں کے ہاں یہ جادوگرنیاں کتنی نازک اور کتنی خوب صورت ہیں :

ماتھا جیسے صندل جاگے باہیں کچی ڈالیاں
آنکھیں جیسے پریم کٹورے زلفیں سوتی ناگنیں
چہروں پر لہراتی اُمنگیں باتوں میں کچھ سادگی
جیسے دیا دوالی ہلکے رنگوں والی جالیاں

خزاں کی شاعری میں محبوبہ کے تین چہرے نظر آتے ہیں ایک تو وہی جسے وہ کہتے ہیں وہ حسین تھی مہ جبین تھی بے گمان تھی بے یقین

تھی۔ یہ لڑکی مثنوی زہرِ عشق کی ٹریجک ہیروئن مہ جبین سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اپنے اندازِ گفتار میں مرزا شوق کی ہیروئن بڑی Active ہے خزاں کی یہ لڑکی بڑی اُداس لڑکی ہے:

گفتگو میں بل، خامشی میں لوچ

رات کروٹیں، کروٹوں میں سوچ

اُس کی آنکھ میں کتنا درد ہے

رنگ زرد ہے روح زرد ہے

وہ اُداس ہے کیوں اُداس ہے

اس کی زندگی کس کے پاس ہے

اس لڑکی کیلئے خزاں نے لکھا ہے:

منہ پہ اوڑھنی "جی کبھی نہیں

میں تو آپ سے بولتی نہیں"

ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنی داستانوں میں پڑھ رہے ہیں کہ شاہزادہ والا منزلت دلدادہ اور شیفتہ ہو کر اس گلفام کے قریب آتا ہے مگر ملکہ مُسکرا کر منہ پھیر کر کہتی ہے: چلو اب منہ دیکھی محبت نہ جتاؤ، میں ایسے بے مروت سے بات نہیں کرتی۔

بات یہ ہے کہ لکھنؤ کی جس تہذیب کا ذکر ہماری داستانوں میں لکھا ہے، خزاںؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جہاں اپنا بچپن اور معصومیت گذاری ہے، اس کا تعلق بھی اسی تہذیب سے ہے۔ وہ اسی نظم میں کہتے ہیں:

یہ گناہ کیوں بھول کیوں نہیں

باغ میں تمام پھول کیوں نہیں

یہ بنیادی سوال ہے اور خزاںؔ کی شاعری میں ایسے بنیادی سوال آتے ہیں جن کے ہر سوال سے افلاک کا ساتواں در کھلتا ہے۔ مغرب کے مفکر کلاسیکی نقطۂ نظر کا فن کار اُسی کو مانتے ہیں جو آدم کے Original-sin میں یقین رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو آپ کو خزاںؔ غیر کلاسیکی نظر آئیں گے۔ مگر خزاںؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اپنی روایت سے تھوڑی بہت جان پہچان ضرور ہونی چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ خزاںؔ کلاسیکی سے زیادہ رومانی اور رومانی سے زیادہ جدید ہے۔ کلاسیکیت سے لگاؤ نے صرف جذبات کی تہذیب میں مدد کی ہے۔ رومانویت نے اُن میں زندگی کے حیرت ناک اور منفرد مظاہر سے دلچسپی پیدا کر دی ہے اور خزاںؔ جدید ان معنوں میں ہیں کہ وہ کائنات کو خیر نہیں سمجھتے۔

بالکل نہیں۔

انہوں نے مُردہ علامتوں سے ممکنہ حد تک گریز کیا ہے۔ نئی علامتیں ان کے شاعرانہ لہو سے برآمد ہوئی ہیں اور اکثر شاعروں کے لہو میں شامل ہوگئی ہیں۔ مثلاً کچھ نئی علامتیں دیکھئے: روشنی کے آنچل، تیرگی کے دھاگے فلسفوں کے ویرانے، ناچتے جزیرے، رات کا اجالا، ادھورے کانپتے چاند، جُوئے فسردہ سرِشام، اُداس پانی، جگمگاتے ہوئے پھول، صندلی جنگل اور متوالے ناگ اور ان سب سے بڑھ کر چور کی طرح سَرکتی ہوئی ہوئی رگوں میں کوئی آگ۔

خزاں روشنی کے آنچل میں تیرگی کے دھاگے نہیں دیکھ سکتے۔ یہیں وہ رومانویت کی فضا سے نکل کر جدیدیت کی فضا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ رومانویت کا آغاز ہی جس روسو کی فکر سے ہوا تھا وہ اِس بات پر یقین رکھتا تھا کہ انسانی فطرت بنیادی طور پر خیر ہے۔ چنانچہ رومانویت کی ساری فضا النسانیت کے اِسی خوبصورت تصور سے آباد ہے۔

آپ ذرا خزاں کی شاعری میں جھانک کر دیکھئے تو آپ کو استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں کے پردے میں اپنے عہد کی متحرک Dynamic تصویریں نظر آئیں گی۔ ان میں سو طرح کی زنجیریں بھی ہوں گی فلسفوں کے ویرانے

بھی ہوں گے، سیاست کی گھن گرج بھی ہو گی اور کانپتے ہوئے سیارے بھی، روشنی بھاگتی ہوئی، اندھیرے اُمنڈتے ہوئے جیسے لوگ روشنی سے بھاگ کر چاند کی طرف جا رہے ہوں۔ اِس شاعری کا اعتبار ہی دراصل احساس اور اظہار کی سچائی پر قائم ہے، یہ اظہار بھی بس ممکنہ حد تک ہو سکتا ہے کیونکہ ہر خیال کسی نہ کسی خیال کا سایہ ہوتا ہے لیعنی زیادہ گہرے خیال کا سایہ اور اظہار بھی کسی سچے اظہار کا سایہ ہی ہو سکتا ہے۔ اِن سب باتوں سے الگ محبوب خزاں اِس معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ وہ اپنے احساس کو پورے اِرتکاز کے ساتھ اظہار کا موقعہ دیتے ہیں۔ نیٹشے کہتا ہے کہ میں دس جملوں میں وہ کچھ کہنا چاہتا ہوں جو لوگ پوری پوری کتابوں میں نہیں کہتے۔ یہ بات ہمارے یہاں سب سے زیادہ خزاں پر صادق آتی ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ خزاں نے شعر کم کہے ہیں مگر جو شعر کہے ہیں، اچھے کہے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر اچھی چیزیں کم ہوں تو دُہری اچھی لگتی ہیں۔

عشق کے محاذ پر انہوں نے کیا کچھ کیا، کس طرح جیتے اور کتنی بار ہارے، زندگی میں کہاں تک اُلجھے اور کہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے،

یہ ساری داستان آپ کو اِن اکیلی بستیوں میں مل جائے گی۔

خزاںؔ کی شاعری محبت اور دوسری خواہشات کے درمیان آنکھ کھولتی ہے مگر آنکھ کھولتے ہوئے سوال کرتی ہے۔ خزاںؔ اپنے اِن سوالوں کا دباؤ تو محسوس کرتے ہیں مگر اِن سے نکل بھاگنے کا راستہ نہیں پاتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ادب حقیقی زندگی کی جو تلخی اور جو کلیت ہے کبھی اس سے بلند نہیں ہو سکتا، یعنی آپ ایک گلاس کے نشے سے اُس آدمی کو گرا نہیں سکتے جو خُم کے خُم پی چکا ہو۔ مجھے اکیلی بستیوں میں بے معنویت پر یقین رکھنے والوں کی تنہائی کہیں نہیں ملی۔ یہ اکیلی بستیاں ایسی ہیں جن میں انسان ایک معمولی سی شمع کی صحبت میں بھی صبح کر سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ بظاہر یہ معمولی سی شمع اُس کے خونِ جگر سے روشن ہوئی ہو۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے زہرِ عشق کی ٹریجک ہیروئن کا ذکر کیا تھا۔ زہرِ عشق سے آپ خزاںؔ کی شاعری تک آئیے تو آپ کو یہ محسوس ہو گا کہ آپ کا رومانوی احساس کتنی کروٹیں بدل چکا ہے۔ زہرِ عشق کی ہیروئن زہر کھا کر مر جاتی ہے تو ہیرو بھی اس کی وصیت کے خلاف زہر کھا لیتا ہے اور جب بیہوش رہتا ہے تو خواب دیکھتا ہے کہ اُس کی محبوبہ اُس سے کہتی ہے کہ تو نے زہر کیوں کھایا، تجھے زندہ رہنا چاہیئے تھا،

زندگی کا بوجھ اٹھانا چاہیئے تھا، ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے جس سے میری آبرو پر حرف آئے۔ خیر ہیرو کی آنکھ کھل گئی اور زہر کا اثر جاتا رہا۔

مثنوی زہرِ عشق بڑی المناک داستان لکھی گئی ہے۔ مولانا حالی نے اس کے حسنِ بیان کی تعریف کی ہے اور عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ زہرِ عشق سب سے زیادہ موثر اور حزینہ مثنوی ہے۔ اس کی ہیروئن مہ جبین کے غم میں ہم اپنے آپ کو ایک حقیقی انسان کے رنج و غم کی طرح شریک پاتے ہیں۔ مجنوں صاحب (مجنوں گورکھپوری) کہتے ہیں کہ زہرِ عشق کو اردو ادب میں وہی مرتبہ دنیا چاہیے جو جرمن ادب میں فلسفی افسانہ نگار گوئٹے کے Sorrows of Werther کو ملا ہے۔

لیکن مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ خمار کا یہ قطعہ

ایک محبت کافی ہے

باقی عمر اضافی ہے

کہتا ہے چپکے سے یہ کون؟

"جینا وعدہ خلافی ہے"

ہمارے اندر زہرِ عشق کے حزینہ احساس سے بہت زیادہ گہرا احساس بیدار کرتا ہے، یہاں تک کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے غدار

آپ ہیں، اپنے دل کی قبر میں دفن ہیں اور اپنے آپ سے مکالمہ کہتے ہیں۔ میں جرمن زبان نہیں جانتا اِس لیے گوئٹے سے اِس کا موازنہ نہیں کرسکتا مگر میرا یہ خیال ہے کہ اب تک اردو میں اِس سے بہتر قطعہ نہیں لکھا گیا ہے۔ حُزینہ احساس کے علاوہ اِس قطعہ میں بیان کی نُدرت بھی اہمیت رکھتی ہے۔یہاں ذرا توقف کیجیے۔ چونکہ اکثر حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ادب میں اوریجنل خیال ممکن ہی نہیں ہے اس لیے میں نطشے کے حوالہ سے کہنا چاہتا ہوں۔ نطشے کہتا ہے اُوریجنلٹی کیا ہے ایسی حقیقت کا مشاہدہ جسے اب تک نام نہیں دیا گیا ہے، ایسی حقیقت جس کا ہم ذکر نہ کرسکتے ہوں اور جس سے ہر وقت دوچار رہتے ہوں، اور اِس حقیقت کو کوئی نام دیئے بغیر ہم اِسے دوسروں کو دکھا نہیں سکتے۔جو لوگ زیادہ اُوریجنل ہیں دراصل وہ لوگ ہیں جو حقیقتوں کو نام دے سکتے ہیں۔ یہ قطعہ لکھ کر دراصل خزاںؔ نے ایسے احساس کا اظہار کیا ہے جو ہمارے عہد کے سچے انسان، سچے عاشق کا احساس ہے اور جس احساس کو ہمارے عہد کے بیشتر نوجوان اپنے دلوں میں لیے ہوئے سسکتے رہتے ہیں اور بوڑھے ہوجاتے ہیں۔خزاںؔ نے اپنی شاعری میں اپنا موڈ ہی نہیں اپنی نسل کا بنیادی موڈ دریافت

کیا ہے۔ اِس عہد کی بنیادی تشویش خزاںؔ کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ ہائیڈیگر
کے لفظوں میں یہ تشویش ہمارے وجود کا مرکزی حصہ ہوتی ہے۔ خزاںؔ کے
یہاں بین الاقوامی تباہی کے امکانات اور اس میں جنم لینے والی تشویش،
شر کی جگہ جگہ کارفرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں جس طرح
محبوب کے تین چہرے نظر آتے ہیں ایک وہ جو حسین تھی مہ جبین تھی
اور دوسری وہ جو دیوداسی ہے اس کے علاوہ امر ہے، لچکتی ٹہنیوں کی
مامتا ہے، لہلہاتی جھومتی پھلواریوں کی تازگی ہے، تیز منڈلاتی ابابیلوں
کے ننھے بازوؤں کا حوصلہ ہے، پھول ہے اور پھول کے انجام سے ناآشنا
ہے اور تیسرا چہرہ شاید وہ ہے جس کے لیے شاعر سات برس چپ
رہا مگر وہ سات برس لوٹ کر نہیں آئے۔ اسی طرح خزاںؔ کی شاعری میں
ایک حصہ اُن سوالوں کا ہے جنہیں کچھ لوگ مابعدالطبیعاتی سوال کہتے
ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر یہ رہگذر ہے تو پھر اِس رہگذر کے بعد ہے کیا۔ دوسرا
حصہ اُن سوالوں کا جو انسان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دُنیا
اور دل کا تعلق۔ تیسرا حصہ اُن سوالوں کا ہے جو خزاںؔ کی شاعری پڑھ کر
ہمارے اندر بیدار ہوتے ہیں۔ مگر خزاںؔ کے یہ سارے سوالات یہ
سارے احساسات اُن کے ذاتی سوال اور ذاتی احساس بن کر سامنے

نہیں آتے بلکہ اپنی نسل کے نمائندہ احساس بن کر سامنے آتے ہیں۔ خزاںؔ
کا یہ المیۂ احساس اُنہیں اِس عہد کی روح تک پہونچا دیتا ہے۔ یہ احساس
کہ ہماری قسمت میں جھوٹ ہے۔ ہم چاہتے کچھ ہیں اور ہونا کچھ اور ہے

دن ہے جانکاہ، رات ہے دلگیر
جاگتی ہے خیال کی زنجیر

" یہ مجرت کہاں جائے گی؟" سب شیشے چکنا چور ہو گئے
ہیں، ہر طرف ناگ ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے "ایک تھکن ایک اُمنگ"۔
میں نے خزاںؔ کی شاعری پر تھوڑی بہت گفتگو ضرور کر لی ہے۔
اب چلتے چلتے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ ایک دن میں خزاںؔ کی
شاعری کے خوبصورت سے ایک مکان کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ سوچ
رہا تھا، اسی طرح تقریباً میں ایک گھنٹہ بیٹھا رہا۔ خزاںؔ چونکہ کسی
مہمان سے گفتگو کر رہے تھے میں نے سوچا کہ چلو اب گھر چلتے ہیں
مگر پلٹ کر جو دیکھا تو دیکھا کہ تین چار نوجوان آنکھ بچا کر نکلنا چاہتے ہیں
ان کے ہاتھ میں خزاں کی شاعری کے کئی قافیے، کئی ردیفیں، کئی ٹکڑے،
کئی ترکیبیں، کئی خیال نظر آئے۔ میں نے کہا جناب یہ کیا لے جا رہے
ہیں آپ یہ تو محبوبِ خزاںؔ کے مصرعے ہیں تو انہوں نے سر اُسی طرح

جھکائے ہوئے کہا نہیں نہیں آپ کو کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ یہ مجبوب خزاں کے مصرعے نہیں ہیں۔ یہ آئینے ہیں جس میں ہمیں اپنے چہرے نظر آتے ہیں۔

شاید یہ انہوں نے سچ کہا تھا اس لیے کہ خزاں نے ہمیشہ وہی لکھا ہے جو محسوس کیا ہے۔ خیالات کے پیچھے نہیں دوڑے بلکہ اپنی زندگی سے شاعری کا باغ کھلا دیا ہے جہاں ایسا لگتا ہے کہ پرندے ابھی آشیانوں سے اتر آئیں گے، پہاڑوں سے سورج کی کرن پھوٹ رہی ہے اور درختوں کے سبز سبز پتوں پر سنہرا پن آرہا ہے۔ ایک نئی زندگی، منفرد زندگی سانس لے رہی ہے، اکیلی بستیوں کا اکیلا شاعر اکیلا ہی نہیں ہمارے عہد کا نمائندہ بھی ہے۔

قمر جمیل

جولائی ۱۹۸۶ء

اکیلی بستیاں

بیکس چمیلی پھولے اکیلی آہیں بھرے دِل جلی
بھُوری پہاڑی خاکی فصیلیں دھانی کبھی سانولی

جنگل میں رستے، رستوں میں پتھر، پتھر پہ نیلم پری
لہریلی سڑکیں چلتے مناظر بکھری، ہُوئی زندگی

بادل، چٹانیں، مخمل کے پردے پردوں پہ لہریں پڑی
کاکل پہ کاکل نیموں پہ خیمے سلوٹ پہ سلوٹ ہری

بستی میں گندی گلیوں کے زینے لڑکے دھماچوکڑی
برسے تو چھاگل ٹھہرے تو ہلچل راہوں میں اِک کھلبلی

گِرتے گھروندے اٹھتی اُمنگیں ہاتھوں میں گاگر بھری
کانوں میں بالے چاندی کے ہلکے پلکیں گھنی کھردری

ہڈّی پہ چہرے چہروں میں آنکھیں، آئی جوانی ہے چلی
ٹیلوں پہ جوبن ریوڑ کے ریوڑ، کھیتوں پہ جھالر چڑھی

وادی میں بھیگے روڑوں کی پیٹی چشموں کی چمپا کلی
سانچے نئے اور باتیں پُرانی مٹی کی جادوگری

یہ جو ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں رات کو
رات کیا سمجھ سکے ان معاملات کو

حسن اور نجات میں فصل مشرقین ہے
کون چاہتا نہیں حسن کو نجات کو

یہ سکون بے جہت یہ کشش عجیب ہے
تجھ میں بند کر دیا کس نے شش جہات کو

آنکھ جب اُٹھے بھر آئے شراب کہا نہ جائے
کیسے بھُول جایئے بھُولنے کی بات کو

ساحلِ خیال پر کہکشاں کی چھُوٹ تھی
ایک موج لے گئی اُن تجلیات کو

دیکھ اے مری نگاہ، تو بھی ہے جہاں بھی ہے
کس نے با خبر کہا دُوسرے کی ذات کو

کیا ہُوئیں روایتیں اب ہیں کیوں شکایتیں
عشقِ نامُراد سے حُسنِ بے ثبات کو

اے بہارِ سرگراں تو خزاں نصیب ہے
اور ہم ترس گئے تیرے التفات کو

○

سونی سونی سہانی سہانی

اُف یہ فصلِ محبت۔ جوانی

○

سادہ نگاہیں کاجل آنسو

دِل کو لگے تو ہر شے جادُو

دیوار سے گفتگو

کسی ہنستی بولتی جیتی جاگتی چیز پر — یہ گھمنڈ کیا یہ گمان کیوں

کہیں اور آپ کی جان کیوں

یہ تو سلسلے ہیں اسی فریبِ خیال کے — غمِ ذات و خیر و جمال کے

وہی پھیر اہلِ سوال کے

اجی ٹھیک ہے یہ وفا کا زہر نہ گھولیے — ارے آپ جھوٹ ہی بولیے

نہیں سب کے بھید نہ کھولیے

کوئی کیا کرے نہ ملیں جو رنگ ہی رنگ سے　　ڈرو اپنے جی کی اُمنگ سے

کٹے کیوں نگاہ، پتنگ سے

کبھی بیکسی کو پکارتے ہیں شجر، حجر　　مرے پاس کچھ بھی نہیں مگر

بڑی زندگی ہے اِدھر اُدھر

یہ سنبھلتے ہاتھوں میں کانپتی ہے کمان کیوں　　یہ سرک رہی ہے مچان کیوں

یہ کھسک رہے ہیں مکان کیوں

○

سکوں پیام اداؤں کو مہرباں دیکھو
سمجھ گئے تو کوئی اور آستاں دیکھو

وہی قیامتِ احساس ہے جدھر جاؤ
وہی حکایتِ لبریز ہے جہاں دیکھو

یہ دیکھتے ہوئے دِن سوچتی ہوئی راتیں
یہ تیرگی یہ اُجالوں کے کارواں دیکھو

یہ زندگی ہے تمہاری، اگر خرید سکو
نہیں تو خیر، ذ ری راہِ رفتگاں دیکھو

یہ رنگ جن میں زمانوں کی آگ لرزاں ہے
یہ خواب کاریِ جذبات رائیگاں دیکھو
ہجومِ عکس و تناظر، سکونِ پردہ ساز
یہ ایک بزم سی لفظوں کے درمیاں دیکھو
یہ جگمگاتے ہوئے پھول، راکھ ہونے تک
یہ شعلہ زار یہ اُٹھتی جوانیاں دیکھو
وہ موج لوٹ گئی، اُس کو لوٹ جانا تھا
یہ تازہ تازہ گہر کار سیپیاں دیکھو

یہ نرم خواب سفینے جزیرہ ہائے تلاش
وہ ہم خرام کناروں کی بستیاں دیکھو

عذابِ دیدہ و دل سے نجات ممکن ہے
تو بھول جاؤ، مگر بھول کر کہاں دیکھو
ابھی نہیں ابھی کچھ اور دیکھنا ہے خزاں
طلسم بندیٔ آئینۂ جہاں دیکھو

دیو داسی

ایک سچّا آدمی ــــــ وُہ بھی نہیں

مہرباں سمجھی جسے

اپنا دِل اپنا لہُو سب کچھ نچھاور کر دیا

آنسوؤں سے پاؤں دھوتے، پاؤں سے آنکھیں ملیں

کون سمجھے گا مجھے

ہر طرف دیوار ہے

رنگ وُہ باہنوں سے اُترا ڈالیاں مُرجھا گیئں

اُن بہاروں کو بہاریں کھا گیئں

خواب ہے سب خواب ہے

زندگی میری سہیلی ساتھ کھیلی بس کہ اب

میں تو بالکل تھک گئی اس ناچ سے

رقص و نغمہ کچھ نہیں

ضرب ہے مضراب ہے

پھینک دے یہ پھول اس کھڑکی سے باہر پھینک دے

پھول اب کس کے لیے

دیوتا سچّے نہیں

دیوتا سچّے نہیں وہ بھی نہیں

○

پلکوں پر حسرت کی گھٹائیں ہم بھی پاگل تم بھی

جی نہ سکیں اور مرتے جائیں ہم بھی پاگل تم بھی

دونوں اپنی آن کے سچّے دونوں عقل کے اندھے

ہاتھ بڑھائیں، پھر ہٹ جائیں ہم بھی پاگل تم بھی

خواب میں جیسے جان چھڑا کر بھاگ نہ سکنے والے

بھاگیں اور وہیں رہ جائیں ہم بھی پاگل تم بھی

صندل پھوٗلے، جنگل جاگے، ناگ پھریں متوالے

ننگے پاؤں چلیں، گھبرائیں ہم بھی پاگل تم بھی

چاند کے مُسافر

زندگی کو دیکھا ہے زندگی سے بھاگے ہیں
روشنی کے آنچل میں تیرگی کے دھاگے ہیں
تیرگی کے دھاگوں میں خُون کی روانی ہے
درد ہے محبّت ہے حُسن ہے جوانی ہے
ہر طرف وہی اندھا کھیل ہے عناصر کا
تیرتا چلے ساحل ڈُوبتا چلے دریا

چاند ہو تو کاکل کی لہر اور چڑھتی ہے

رات اور گھٹتی ہے بات اور بڑھتی ہے

یہ کشش مگر کیا ہے ریشمی لکیروں میں

شام کیسے ہوتی ہے ناچتے جزیروں میں

ہر قدم نئی اُلجھن سو طرح کی زنجیریں

فلسفوں کے ویرانے دُوسروں کی جاگیریں

آندھیاں اُجالوں کی گھن گرج سیاست کی

کانپتے ہیں سیّارے، رات ہے قیامت کی

جنگ سے جلے دُنیا چاند کو چلے پاگل

آنکھ پر گرے بجلی کان میں پڑے کاجل

دُور ہے پرندوں کا چھیڑ ہے ستاروں سے

کائنات عاجز ہے ہم گُناہگاروں سے

یہ تھکن کہاں تک ہے کیا خبر چکوروں کو

کیوں ہرے بھرے جنگل ڈھونڈتے ہیں موروں کو

لاکھ دِل کو سمجھاؤ لاکھ اِدھر اُدھر دیکھو

ایک ہی طرف آخر سب کو دیکھ کر دیکھو

تیرگی خراماں ہے روشنی گریزاں ہے

وقت کے سمندر میں تہ بہ تہ چراغاں ہے

خواب جینے والوں کے چال مرنے والوں کی

اپنے پاس حسرت ہے کچھ نہ کرنے والوں کی

دلرُبا ڈھلی رنگت مہ رُبا چڑھی آنکھیں
سوتی جاگتی ہلچل جیتی جاگتی آنکھیں

اس ہجومِ حیراں میں ہم جو سب سے آگے ہیں
چاند کے مُسافر ہیں چاندنی سے بھاگے ہیں

○

وُہ رات ختم ہُوئی اور کل کی بات ہُوئی
مگر نہیں یہ سویرا ہُوا کہ رات ہُوئی
بُرا نہ مان جو شکوے نہیں ان آنکھوں میں
غزل کہ تیری محبّت تھی اپنی ذات ہُوئی

○

میں تمہیں کیسے بتاؤں کیا کہو
کم کہو اپنا کہو اچھا کہو
یہ بتاؤ جان چھُوٹے کس طرح
اب تو ہے چاہت کہو جھگڑا کہو

تمہاری قسمت میں جھوٹ ہے

تمہاری قسمت میں جھوٹ ہے اس لیے کہ تم نے

مجھے بتایا کہ " اور بھی ہیں"

ہماری قسمت میں جھوٹ ہے اس لیے کہ ہم نے

فریب کھایا کہ " اور بھی ہیں"

ہماری رُوحیں تڑپ رہی تھیں کہ سچ بھی ہو زندگی میں شاید

ہر اک میں شاید کسی میں شاید

بڑی ستمگر تھی شام لیکن وُہ آگ ہے رات کا اُجالا

کہ ہم نے سب سوچ کر خُوشی سے

بہار ہستی کو پھُونک ڈالا

ہماری رُوحیں تڑپ رہی ہیں کہ سچ بھی ہو زندگی میں شاید

ہر اک میں شاید کسی میں شاید

ناز و انداز دِل دُکھانے لگے
اب وُہ فتنے سمجھ میں آنے لگے

پھر وہی انتظار کی زنجیر
رات آئی دِیے جلانے لگے

چھاؤں پڑنے لگی ستاروں کی
روح کے زخم جھلملانے لگے

حال احوال، کیا بتائیں کیسے
سب ارادے گئے ٹھکانے لگے

منزلِ صبح آگئی شاید
راستے ہر طرف کو جانے لگے

میری آنکھوں کی روشنی

میری آنکھوں کی روشنی
دیکھ، دُنیا کچھ اور ہے
شبِ ہجراں کے چاند میں
ہم نے دیکھا کچھ اور ہے
چاہتے ہم کچھ اور ہیں
اور ہونا کچھ اور ہے
میری آنکھوں کی روشنی
تو مرے پاس آئے گی

دُوسری کروٹ

اپنی آنکھوں سے تجھ کو دُور کیا
تیرے پرتو سے کسبِ نُور کیا
میں نے تجھ پرستم ضرُور کیا

دِن ہے جانکاہ رات ہے دِلگیر
جاگتی ہے خیال کی زنجیر
میرے دِل تُو نے کیا قصُور کیا

کیف سے خمار تک

وُہ حسین تھی مہ جبین تھی	بے گمان تھی بے یقین تھی
زندگی کی نرم نرم آہٹیں	بے سبب یُونہی مسکراہٹیں
انگلیوں میں بال کو لپیٹنا	دامنِ خیال کو لپیٹنا
ہر گھڑی وہی مِلنے والیاں	بے خیالیاں خوش خیالیاں
نرم اُلجھنیں کم سِنی کے خواب	انگ انگ میں چھیڑا انقلاب
مُنہ پر اوڑھنی "جی کبھی نہیں	میں تو آپ سے بولتی نہیں"
اور پھر حیا زندگی کی مار	معرفت کا بوجھ، جبر و اختیار

ایک جان اور سینکڑوں دبال   جسم کی دُکھن، رُوح کا خیال

زندگی بڑھی روشنی لیے   روشنی بڑھی تیرگی لیے

انکسار میں اِک غرور سا   کچھ خمار سا کچھ سرور سا

دائرے یہاں دائرے وہاں   رقص میں نظر رقص میں جہاں

گفتگو میں بَل خاموشی میں لوچ   رات کروٹیں کروٹوں میں سوچ

دِل بُجھا بُجھا تشنگی کی آنچ   اجنبی تھکن زندگی کی آنچ

اِس کے کام آئیں اُس کا دُکھ بٹائیں   اُس کو چھیڑ دیں اور مُسکرائیں

اُس کی آنکھ میں کتنا درد ہے   رنگ زرد ہے رُوح زرد ہے

وہ اُداس ہے کیوں اُداس ہے   اُس کی زندگی کِس کے پاس ہے

یہ گناہ کیوں بھُول کیوں نہیں   باغ میں تمام پھول کیوں نہیں

○

محبّت کو گلے کا ہار بھی کرتے نہیں بنتا
کچھ ایسی بات ہے انکار بھی کرتے نہیں بنتا
خلوصِ ناز کی توہین بھی دیکھی نہیں جاتی
شعورِ حسن کو بیدار بھی کرتے نہیں بنتا
تجھے اب کیا کہیں اے مہرباں اپنا ہی رونا ہے
کہ ساری زندگی ایثار بھی کرتے نہیں بنتا

ستم دیکھو کہ اُس بے درد سے اپنی لڑائی ہے

جسے شرمندۂ پیکار بھی کرتے نہیں بنتا

جوانی، مہربانی، حسن بھی اچھی مصیبت ہے،

اِسے اچھا اُسے بیمار بھی کرتے نہیں بنتا

بھنور سے جی بھی گھبراتا ہے لیکن کیا کیا جائے

طوافِ موجِ کم رفتار بھی کرتے نہیں بنتا

اِسی دِل کو بھری دُنیا کے جھگڑے جھیلنے ٹھہرے

یہی دِل جس کو دُنیادار بھی کرتے نہیں بنتا

جلاتی ہے دِلوں کو سرد مہری بھی زمانے کی

سوالِ گرمیٔ بازار بھی کرتے نہیں بنتا

خزاںؔ اُن کی توجّہ ایسی ناممکن نہیں لیکن

ذرا سی بات پر اصرار بھی کرتے نہیں بنتا

یہ محبّت کہاں جائے گی

یہ جنوں ہے مری ہی خطا میں ہی سمجھا نہیں
بِن کہے کوئی سُنتا نہیں کوئی سُنتا نہیں
اُس طرف اے بہارِ کرم میں نے دیکھا نہیں

تو سوئے کارواں جائے گی
یہ محبّت کہاں جائے گی

یہ بلائے پری چہرگاں   بیکسی کے لیے

دامنِ حسرتِ جاوداں   آگہی کے لیے

ہر طرف جُوئے مے ہے رواں   تشنگی کے لیے

تشنگی رائیگاں جائے گی

یہ محبّت کہاں جائے گی

گردِ سفر

پھر پنڈی سے لاہور چلے آنکھوں میں دِل کا چور چلے
من کے جنگل میں مور چلے

منظر ہے سہانا غم کی طرح گرتا ہے دُھواں شبنم کی طرح
ٹھنڈی ہے سڑک. موسم کی طرح

وُہ ظاہر یا مستُور گئے سب شیشے چکنا چُور گئے
کچھ لوگ چلے کچھ دور گئے

جادُو کرنے والیاںؑ

سیدھی سادی بھولی بھالی جادو کرنے والیاں

ماتھا جیسے صندل جاگے باہیں کچی ڈالیاں

انکھیں جیسے پریم کٹورے زلفیں سوتی ناگنیں

چہروں پر لہراتی اُمنگیں باتوں میں کچھ سادگی

جیسے دیا دوالی ہلکے رنگوں والی جالیاں

سیدھی سادی بھولی بھالی جادُو کرنے والیاں

✓

○

آئینے کہتے ہیں اُس خواب کو رُسوا نہ کرو

ایسے کھوئے ہُوئے انداز سے دیکھا نہ کرو

کیسے آجاتی ہے کونپل پہ یہ جادُو کی لکیر

دِن گزُر جاتے ہیں محسوس کرو یا نہ کرو

کہیں دیوارِ قیامت کبھی زنجیرِ ازل

کیا کرو عشقِ زیاں کیش میں اور کیا نہ کرو

بھاگتے جاؤ کسی سمت کسی سائے سے
تذکرہ ایک ہے، افسانہ درافسانہ نہ کرو

پھر کوئی تازہ گھروندا کسی ویرانے میں
گاؤں کو شہر کرو شہر کو ویرانہ کرو

بزمِ امکاں، ہوئی دو گھونٹ لہو آنکھوں میں
حرص کہتی ہے، کہ کونین کو پیمانہ کرو

کیوں نہ ہو مجھ سے شکایت تمھیں، تم وہ ہو کہ پھر
اسے جیتا بھی نہ چھوڑو جسے دیوانہ کرو

ایک ہی رات سہی پھول تو کھلتے ہیں خزاں
موت میں کیا ہے کہ جینے کی تمنّا نہ کرو

رات اور دِن

میں نے محسوس کیا ہے تو کھُلی ہیں آنکھیں
میں نے محسوس کیا ہے تو جلے ہیں یہ چراغ

یہ چراغاں یہ چمن کیسے ملے ان سے نجات
سانس لینے کو ٹھہر جاؤ تو جادو کا حصار
ہر طرف شعلہ زباں ناگ ہیں پھن جھومتے ہیں
سَر اٹھاتے ہیں نئے راگ نئی راگنیاں
پاؤں پڑتے ہیں گلے پڑتے ہیں انجانے خیال
کیا مرے پاس مگر ایک تھکن ایک اُمنگ

ایک جینے کی لگن ایک محبت کا لہو
نہ اندھیرے نہ اُجالے سے عداوت ہے مجھے
رات سے دِن ہے مگر مجھ کو تو دونوں سے ہے کام
کام جھوٹا ہو تو پہچاننے والے بھی کئی
رنگ سچے بھی نہ ہوں لوگ بُرا مانتے ہیں
چلتی پھرتی ہیں دریچوں میں کئی تصویریں
کیا کروں میں تری دُنیا ہے مری آنکھیں ہیں
رات اور دن میں کوئی فرق نہیں ہے ایسا
میں نے محسُوس کیا ہے تو کھلی ہیں آنکھیں
میں نے محسوس کیا ہے تو جلے ہیں یہ چراغ

سوَال

تمہارے پاس جسم ہے جمال ہے
یہ آب و گِل یہ کھیلتی پھوار
جیسے انتظار
یہ رنگ و نم یہ زیر و بم یہ امتزاجِ جسم بہ جسم
یہ تشنگی یہ جامِ جسم
نہ جانے کیوں مگر مِری نگاہِ بے خیال میں
یونہی سا اِک خیال ہے
تمہارے پاس جسم ہے جمال ہے

جوابِ ہر سوال ہے

تمہاری زُلفِ ریشمیں بڑا حسین خیال ہے

مگر مری نظر میں ہے وہی جمالِ بے نشاں

وہی سوالِ جاوداں

○

ایک محبّت کافی ہے

باقی عُمر اضافی ہے

کہتا ہے چُپکے سے یہ کون

"جینا وعدہ خلافی ہے"

○

ہجرت ہے شہر شہر وطن کی تلاش میں

بادِ صبا چلی ہے چمن کی تلاش میں

اپنی تلاش کون کرے دُور کون جائے

اہلِ سخن ہیں اہلِ سخن کی تلاش میں

○

جی چاہتا ہے، کس نے کہا، مت خریدیے

دولت سے حُسن، حُسن سے دولت خریدیے

کچھ لوگ جی رہے ہیں شرافت کو بیچ کر

تھوڑی بہت انہیں سے شرافت خریدیے

پھیلا ہے کاروبارِ مروّت، سو آپ بھی

سب کی طرح، کسی کی ضرورت خریدیے

گہرائیوں کی فکر میں کیوں مبتلا ہیں آپ

لکھیے غزل عوام پہ شہرت خریدیے

کہتے ہیں جس کو شعر دُعا کا مقام ہے

رُسوائیاں کمائیے عبرت خریدیے

آنکھیں رہیں تو رنگ بہت روشنی بہت

اب ہو سکے تو پردۂ غفلت خریدیے

کیوں آپ شرمسار ہیں اپنے وجود سے

سچ بولیے، جہاں کی عداوت خریدیے

دُنیا کے روگ جھیلئے کمرے میں بیٹھ کر

کھڑکی کے پاس جائیے حسرت خریدیے

عُمرِ عزیز وقت نہیں مول تول کا

بازار اُٹھ چکا، اجی حضرت خریدیے

بے رنگ ہے حکایتِ خونِ جگر خزاں

خُونِ جگر سے رنگ کی قیمت خریدیے

مگر نہیں شاید

بکھر گئے وُہ خیالات پھر اندھیرا ہے
ذرا سی دیر کو بجلی کی لہر آئی تھی
دکھائی دینے لگے تھے ادُھورے کانپتے چاند
ذرا سی دیر کو جاگا تھا رات کا احساس
پلٹ پلٹ کے نہ دیکھو مجھے نہیں معلوم
یہ وقت کیسے کٹا رات کیسے گذُرے گی

جو لوگ مر نہیں جاتے وہ زندہ رہتے ہیں

سُنا تو ہے کہ ستارے ہیں ابر کے اُس پار

تمام عُمر پڑی ہے مگر نہیں شاید

گزر چکا ہے وُہ سب کچھ جو ہونے والا ہے

سالگرہ کی رات

وقت کی بات ہے ہر غنچۂ سربستہ مگر
وقت کیا چیز ہے پیمانۂ خود ساختہ ہے
یہ شب و روز جوانی یہ مہ و سالِ رواں
رُوح کیوں جسم کے آگے سپر انداختہ ہے

شاخ در شاخ نظر آتی ہے جینے کی اُمنگ
چور کی طرح سرکتی ہے رگوں میں کوئی آگ

سوچنے کے لیے شاید یہ مہ و سال نہیں
اے مرے دیدۂ بے خوابِ محبت سے نہ بھاگ

حُسن کی آگ غنیمت ہے کہ اِس سے پہلے
رگِ ایّام تھی اِک جوئے فسردہ سرِ شام
سب اسی آگ کا ایندھن ہیں گزُرنے والے
ایک ہی لرزشِ صد رنگ کا پر تو ہے تمام

○

سنبھالنے سے طبیعت کہاں سنبھلتی ہے
وُہ بیکسی ہے کہ دُنیا رگوں میں چلتی ہے
تمام آنکھوں میں آنسو ہیں، کیسے ہوتے ہیں
وہ لوگ جن کے لیے زندگی بدلتی ہے
تمھیں خیال نہیں کس طرح بتائیں تمھیں
کہ سانس چلتی ہے لیکن اداس چلتی ہے

وُہ چال ہو کہ بدن ہو کمان جیسی کشش
قدم سے گھات ادا سے ادا نکلتی ہے

بکھر گئے مجھے سانچے میں ڈھالنے والے
یہاں تو ذات بھی سانچے سمیت ڈھلتی ہے

خزاں ہے حاصلِ ہنگامۂ بہار و خزاں
بہار پھولتی ہے کائنات پھلتی ہے

دِن بہار کے

اِس بہار کی چبھن میں اُس بہار کی تھکن ہے

جو گزر گئی

ہم قلم یہ پوچھتے ہیں اتنے دِن کہاں گنوائے

شعر کیا ہوئے

ہم سفر یہ سوچتے ہیں اِس کو اور ہی لگن ہے

اِس کو چھوڑ دو

دلربا یہ دیکھتے ہیں اِس کے آنکھ ہی نہیں ہے

اِس کا کیا کریں

کیا بتائیں کیوں بتائیں کون ہے جسے بتائیں

چھیڑتی چلیں ، ہوائیں' جاگتی شبیں جگائیں

دِن' بہار کے

رہگزر کے بعد

میں سوچتا ہوں کہ اس خیر و شر کے بعد ہے کیا

فضا تمام نظر ہے نظر کے بعد ہے کیا

شب انتظارِ سحر ہے سحر کے بعد ہے کیا

دعا برائے اثر ہے اثر کے بعد ہے کیا

یہ رہگزر ہے تو اس رہگزر کے بعد ہے کیا

✓

○

جنوں سے کھیلتے ہیں آگہی سے کھیلتے ہیں
یہاں تو اہلِ سخن آدمی سے کھیلتے ہیں

نگارِ میکدۂ سب سے زیادہ قابلِ رحم
وہ تشنہ کام ہیں جو تشنگی سے کھیلتے ہیں

تمام عمر یہ افسردگانِ محفلِ گل
کلی کو چھیڑتے ہیں بیکلی سے کھیلتے ہیں

فرازِ عشق نشیب جہاں سے پہلے تھا
کسی سے کھیل چکے ہیں کسی سے کھیلتے ہیں

نہا رہی ہے دھنک زندگی کے سنگم پر
پرانے رنگ نئی روشنی سے کھیلتے ہیں

جو کھیل جانتے ہیں ان کے اور ہیں انداز
بڑے سکون بڑی سادگی سے کھیلتے ہیں

خزاںؔ کبھی تو کہو ایک اس طرح کی غزل
کہ جیسے راہ میں بچے خوشی سے کھیلتے ہیں

○

پھر وہی سلسلہ تشنگی کا
دِل کشی دِل کی عادت پُرانی

○

دیکھتے ہیں بے نیازانہ گزُر سکتے نہیں
کتنے جیتے اس لیے ہونگے کہ مر سکتے نہیں

درودیوار سے کہوں گا

یہ جنگل یہ اُداس پانی
اکیلی بستیاں سُہانی
سرکتی چھاؤں ہے جوانی
خیالِ یار سے کہوں گا

یہ ویرانی قیامت انگیز
تھکن سے انگ انگ لبریز
تری رفتار ہے بُہت تیز
تری رفتار سے کہوں گا

وہ ساحل، موت سے حسیں ہے

یہ موجیں، کون تہ نشیں ہے

یہ کشتی ڈوبتی نہیں ہے

کسی منجدھار سے کہوں گا

تم کہاں ہو

میں تمہاری رُوح کی انگڑائیوں سے آشنا ہوں

میں تمہاری دھڑکنوں کے زیر و بم پہچانتا ہوں

میں تمہاری انکھڑیوں میں نرم لہریں جاگتی سی دیکھتا ہوں

تم امر ہو تم لچکتی ٹہنیوں کی مامتا ہو

تم جوانی ہو تبسّم ہو محبت کی لتا ہو

میں تمہیں پہچانتا ہوں تم مری پہلی خطا ہو

لہلہاتی جھومتی پھلواریوں کی تازگی ہو بے ادائی کی ادا ہو

تیز منڈلاتی ابابیلوں کے ننھے بازوؤں کا حوصلا ہو

پھول ہو اور پھول کے انجام سے نا آشنا ہو
ڈالیوں پر پھولتی ہو جھولتی ہو دیکھتی ہو بھولتی ہو
ہر نئے فانوس پہ گرتی ہوئی پروانگی ہو
اور خود بھی روشنی ہو
زندگی ہو زندگی کے گرد چکّر کاٹتی ہو
میں تمہیں پہچانتا ہوں تم محبّت چاہتی ہو
خود کو دیکھو اور بھری دنیا کو دیکھو اور سوچو
اور سوچو تم کہاں ہو

✓

○

ہم آپ قیامت سے گزر کیوں نہیں جاتے
جینے کی شکایت ہے تو مر کیوں نہیں جاتے

کتراتے ہیں، بل کھاتے ہیں، گھبراتے ہیں کیوں لوگ
سردی ہے تو پانی میں اُتر کیوں نہیں جاتے

آنکھوں میں چمک ہے تو نظر کیوں نہیں آتا
پلکوں پہ گہر ہیں تو بکھر کیوں نہیں جاتے

یہ بات ابھی مجھ کو بھی معلوم نہیں ہے
پتھر اِدھر آتے ہیں اُدھر کیوں نہیں جاتے

تیری ہی طرح اب یہ ترے ہجر کے دِن بھی
جاتے نظر آتے ہیں مگر کیوں نہیں جاتے

اب یاد کبھی آئے تو آئینے سے پُوچھو
محبوبؔ خزاں شام کو گھر کیوں نہیں جاتے

اتنا حُسن کیا کرو گے

چتونیں رِجھانے والی

سادگی ستانے والی

ہر ادا لبھانے والی

کون سی ادا کرو گے

اتنا حُسن کیا کرو گے

یہ جو لوگ ہیں بچارے

اپنی بیکسی کے مارے

سب اسیر ہیں تمہارے

کس طرح وفا کرو گے
اتنا حُسن کیا کرو گے

اب چُھری ہے یا گلا ہے
دلکشی بُری بلا ہے
یہ بدن کدھر چلا ہے

جاگتے رہا کرو گے
اتنا حُسن کیا کرو گے

کس نے کہا آپ سے میری مصیبت ہے کیا

اب یہ ندامت ہے کیوں اس کی ضرورت ہے کیا

اب یہ توجّہ ہے کیوں میرے شب و روز پر

اپنے شب و روز سے آپ کو فرصت ہے کیا

کون دکھائے مجھے شام ہے کتنی حسیں

کون بتلائے مجھے وقت کی قیمت ہے کیا

اِتنے سماں اتنے شہر ایک لگن ایک لہر

سات برس چپ رہے اور شکایت ہے کیا

اس بھرے بازار میں ہم تو اکیلے خزاں

کیوں ہیں مرے ساتھ لوگ غم کوئی دولت ہے کیا

حسرتِ آب و گِل دوبارہ نہیں

دیکھ "دُنیا نہیں" ہمیشہ نہیں

سوچنے کا کوئی نتیجہ نہیں

سایہ ہے' اعتبارِ سایہ نہیں

اچھے لگتے ہیں اچھے لوگ مجھے

جو سمجھتے ہیں اُن سے پردہ نہیں

سادہ کاری کئی پرت کئی رنگ
سادگی اک ادائے سادہ نہیں

حالِ دِل اتنے پیار سے مت پوچھ
حال آئندہ ہے گزشتہ نہیں

تجھ سے بھاگے سکون سے بھاگے
سرگراں ہیں کہ دل گرفتہ نہیں

رات زنجیر سی قدم بہ قدم
ایک منزل ہے کوئی جادہ نہیں

چاندنی کھیلتی ہے پانی سے
اتنی برسات ہے کہ سبزہ نہیں

میں کہیں اور کس طرح جاؤں
تو کسی اور کے علاوہ نہیں

سُنتے ہیں اِک جزیرہ ہے کہ جہاں
یہ بلاتے ہوا کسِ حمنسہ نہیں

میکدے روز سوتے جاگتے ہیں
تشنگی کم نہیں، زیادہ نہیں
کیسے بیدرد ہیں کہ جوڑتے ہیں
نرم الفاظ جن میں رشتہ نہیں
کہیں ایجادِ محض بے مفہوم
کہیں مفہُوم ہے تو لہجہ نہیں
کہیں تصویر ناک نقشے بغیر
کہیں دِیوار ہے دریچہ نہیں
اُن سے کاغذ میں جان کیسے پڑے
جن کی آنکھوں میں عکسِ تازہ نہیں

خاک سے کِس نے اُٹھتے دیکھی ہے
وہ قیامت کہ استعارہ نہیں
دُشمنی ہے تو دُشمنی ہی سہی
میں نہیں یا دُکانِ شیشہ نہیں
کبھی ہر سانس میں زمان و مکاں
کبھی برسوں میں ایک لمحہ نہیں
اے ستارو کِسے پُکارتے ہو
اِس خرابے میں کوئی زِندہ نہیں
حسرتِ انکارِ خامہ سمجھ
یہ صدائے شکستِ خامہ نہیں

کتبہ

اِس خاک میں تھے حُسن و بصیرت کے خزینے
محنت کے مہ و سال شرافت کے پسینے
شاعر کو نہ آئے تھے فراست کے قرینے
آنکھوں میں پھر آنسو ہیں محبت کے دفینے
سوتے ہُوئے چلتے ہیں قیامت کے سفینے

○

حُسن سے ہٹ کے محبّت کی نظر جائے کہاں
کوئی منزل نہ مِلے، راہ گزر جائے کہاں
تم بہت دُور رہو ہم بھی کوئی نزدیک نہیں
دِل کا کیا ٹھیک ہے کم بخت ٹھہر جائے کہاں
دیکھئے خواب سحر چاہیئے دیوارِ ازل
رات جاتی نظر آتی ہے مگر جائے کہاں

اپنے اشعار اب اوروں کے یہاں دیکھئے گا

آنکھ پڑتی ہے زمانے کی ہنر جائے کہاں

رُخ صحرا ہے خزاں گھر کی طرف مدت سے

ہم جو صحرا کی طرف جائیں تو گھر جائے کہاں

حال ایسا نہیں کہ تم سے کہیں
ایک جھگڑا نہیں کہ تم سے کہیں
زیرِ لب آہ بھی محال ہوئی
درد اِتنا نہیں کہ تم سے کہیں
سب سمجھتے ہیں اور سب چپ ہیں
کوئی کہتا نہیں کہ تم سے کہیں

کس سے پوچھیں کہ وصل میں کیا ہے
ہجر میں کیا نہیں کہ تم سے کہیں
اب خزاں یہ بھی کہہ نہیں سکتے
تم نے پوچھا نہیں کہ تم سے کہیں

○

چاہی تھی دِل نے تجھ سے وفا کم بہت ہی کم
شاید اسی لیے ہے گِلا کم بہت ہی کم

کیا حُسن تھا کہ آنکھ لگی سایہ ہو گیا
وہ سادگی کی مار حیا کم بہت ہی کم

تھے دُوسرے بھی تیری محبت کے آس پاس
دِل کو مگر سکُون مِلا کم بہت ہی کم

جلتے سُنا چراغ سے دامن ہزار بار
دامن سے کب چراغ جلا، کم بہت ہی کم

اب رُوح کانپتی ہے اجل ہے قریب تر
اے ہم نصیب، ناز و ادا کم بہت ہی کم

یُوں مت کہو خزاں کہ بہت دیر ہوگئی
ہیں آج کل وُہ تم سے خفا کم بہت ہی کم

○

بے نیازی انہیں پسند نہیں

اور ہم اتنے درد مند نہیں

○

اُبھریں ڈوبیں نئے جزیرے

اپنی دُنیا بڑی پرانی

○

ہاں اس نے کہا تھا کہ سدا جلتے رہو گے

مجھ سے نہ کہو گے تو زمانے سے کہو گے

تب میں نے کہا۔ دونوں اٹل، دونوں اکیلے

سمجھو گے تو سمجھو گے سہو گے تو سہو گے

○

دام ہزاروں دل کے لیے

کون چلا منزل کے لیے

دِل لے کراب جائیں کہاں

دُنیا چھوڑی دِل کے لیے

○

یاد کرو کیا میں نے کہا تھا آج محبت ہے کہ نہیں

کروٹ کروٹ آنکھ میں آنسو دِل میں ندامت ہے کہ نہیں

مرتے کو پانی کیا دو گے تم تو جان بھی لے نہ سکے

دیکھو ہم جیتے ہیں ابھی تک تم کو غیرت ہے کہ نہیں

○

کتنی جادوگر ہے جوانی
مٹی پر سونے کا پانی

○

دیکھو دنیا سے بےدل ہے
اپنی اپنی منزل ہے

○

اب اس قدر ستم و جور کے لیے بھی نہیں
یہ زندگی جو کسی اور کے لیے بھی نہیں

○

ہوا چلی تو پھر آنکھوں میں آ گئے سب رنگ
مگر وہ سات برس لوٹ کر نہیں آئے

○

یہ دل نواز اداسی، بھری بھری پلکیں

ارے، ان آنکھوں میں کیا ہے۔ سنو دکھاؤ مجھے

تمہارے واسطے سب کچھ ہے میرے بندہ نواز

مگر یہ شرط کہ پہلے پسند آؤ مجھے

○

پلٹ گئیں جو نگاہیں انہیں سے شکوہ تھا

سو آج بھی ہے مگر دیر ہو گئی شاید